تحریر: ڈاکٹر شازیہ ساجد
اسسٹنٹ پروفیسر کنیئرڈ کالج لاہور

مکتوباتی ادب کی تاریخی اہمیت

This article uses evidence to establish the importance of letter in reshaping the generally known history.

Since letter is a private and concealed form of communication, the writer does not hesitate in sharing even much guarded secrets. When such letters, especially those written to or written by prominent names in history, were divulged, they revealed new and shocking information. Whilst some information gained from these letters offered the missing clues of the history, others, completely challenged the known series of events.

This essay talks about such letters and presents instances where the secrets revealed from letters altered the known course of history.

خطوط بھی اردو ادب کی اہم نثری صنف ہے۔ یہ ادبی صنف ''اورل ہسٹری'' کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔کسی بھی دور میں جب لوگ آپس میں خط و کتابت کرتے ہیں تو اکثر اردگرد پیش آنے والے حقائق کو من وعن بتاتے ہیں ۔ یہ کسی کی خوشنودی کے لیے نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی ان پر کوئی اصول وقوانین لاگو ہوتے ہیں۔ اردو لغات کے مطابق خط، مکتوب، چھٹی یا رقعہ وغیرہ ہم معنی الفاظ ہیں۔اردو لغت بورڈ کراچی کے مطابق خط، کسی چیز کی سطح پر نشان یا علامت، خراش، بدھی، وہ کاغذ جس پر کچھ تحریر کر کے ایک شخص دوسرے شخص کو بھیجتا ہے۔ مکتوب، نامہ، مراسلہ، رقعہ ، چٹھی پرچہ، فرمان، پروانہ، لکھائی، تحریر اور کتابت۔ (مطبوعہ کراچی ۱۹۸۷ء)

انگریزی میں اس کے لیے "Letter" کا لفظ ہے۔ جو بمعنی خط ہے۔ جب کہ "Epistle" بمعنی رقعہ استعمال ہوتا ہے۔معمولی سے فنی فرق کے ساتھ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ عام طور پر "Epistles" سے مراد رسمی یا سرکاری خط لیے جاتے ہیں۔

''خط'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ اندازِ تحریر یعنی لکھائی اور کتابت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ نامہ ،مکتوب اور مراسلہ کے معنی بھی استعمال ہونے لگا۔ خط لکھنے والا مکتوب نگار، جب کہ جس کو خط لکھا جاتا ہے مکتوب الیہہ کہلاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی ''خط'' کی عربی جمع ''خطوط'' کو مکتوبات کے معنی میں استعمال کرنا اور ایک دوسرے عربی لفظ کی طرف اضافت کرنا قاعدے کی رُو سے صحیح نہیں سمجھتے۔لیکن اردو محاورۂ عام ہونے کی وجہ سے اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

خط نویسی کب اور کہاں شروع ہوئی؟ جہاں تک جمع شدہ حقائق رہنمائی کرت یہی حقیقت سامنے آتی ہے، کہ ابلاغ

کی ضرورت نے اِسے جنم دیا ہوگا۔ یا کسی ایسی صورتِ حال نے اسے تخلیق کیا ہے جب ایک شخص کسی دوسرے شخص تک اپنی بات پہنچانا چاہتا ہو اور کوئی تیسرا اس بات سے آگاہ نہ ہو۔

جس طرح ڈاکٹر سید عبداللہ بڑی وضاحت سے کہتے ہیں:۔

''انسان نے جب معیشت کا آغاز کیا ہوگا تو اُسے محسوس ہوا ہوگا کہ بالمشافہ ابلاغ ایک قدرتی سا عمل ہے اور اس کے اظہار میں کوئی دقت نہیں۔ مگر جو لوگ حدِ سماعت کے اندر موجود نہیں اُن تک بھی ابلاغی مقاصد کی خاطر پہنچنے کی بھی کوئی سبیل ہونی چاہئے۔ اس سے مجبور ہو کر ذہن انسانی نے اپنی خداداد قوت مخترعہ سے خط ایجاد کیا۔''[1]

مغربی تحقیق سے ملنے والی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خط نویسی کی ابتدا یونان اور روم سے ہوئی۔ مصر کے فراعین کی خطوط کی الواع بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ مگر تاریخ اسلامی میں خط نویسی کی شہادت حضرت یعقوبؑ کے دور سے بھی ملتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد چہارم ص ۱۵۴) میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخوں اور تفاسیر میں بھی اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔ جب عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) نے اپنے سوتیلے بھائی بن یامین کو مصر میں ہی روک لیا تو حضرت یعقوبؑ نے ان کی رہائی کے لیے حضرت یوسفؑ کو خط لکھا۔ یہ خط عبرانی زبان میں تھا۔ ان تمام حوالوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خط نویسی ۲۰۰۰ ق م میں بھی موجود تھی۔ قدیم دور کے دریافت شدہ خطوط، عبرانی، لاطینی اور اطالوی زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ انگلستان اس خطوط نویسی کی ابتدا اطالوی تراجم سے ہوئی۔

خط نویسی یا مکتوب نگاری کا تعلق انسانی تہذیب و تمدن سے ہے۔ انسان سے وابستہ ہر چیز، فن اور صنف میں اس کی شخصیت کے افکار و اعمال کی ہر جہت دکھائی دیتی ہے۔ اس میں سماجی و معاشرتی اصول اور ادبی قدریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ جو اسے ادبی مقام عطا کرتی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر گیان چند کہتے ہیں:۔

''خطوط میں انسان کسی رنگ و روغن کے بغیر اصلی شکل میں ظاہر ہوتا ہے چونکہ خط یہ جانتے ہوئے لکھا جاتا ہے کہ اسے شائع نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے یہ مکتوب نگار کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت کا سچا آئینہ ہوتا ہے۔''[2]

انسانی زندگی مسلسل مہمات، حادثات و واعقات سے دوچار ہے۔ ادب کی ہر صنف میں عہد بہ عہد اس کا اظہار ملتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی فکر، جذبات اور کیفیات ادب میں جھلکتی ہیں۔

مکتوب نویسی ادب کی ایسی صنف ہے جہاں لفظ بولتے ہیں۔ خاموشی زبان بن جاتی ہے اور نجی زندگی کی تصاویر کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ کسی اور صنف ادب میں یہ خصوصیت نہیں کہ وہ شخصیت کا ہو بہو عکس اُتار سکے۔ کیوں کہ مکتوب نگار اسے انتہائی ذاتی چیز کا خیال کرتے ہوئے، اس کے کبھی منظر عام پر آنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں لاتا۔ سادگی، سچائی، خلوص اور بے ریائی خط کی خصوصیات ہیں۔

اردو ادب میں زندگی کے لمحوں کو محفوظ کرنے والی اس صنف نے بہت تھوڑے عرصے میں ادب کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔ دوسری اصناف ادب کی طرح یہ صنف بھی فارسی سے اُردو میں آئی۔ بیشتر مسلم سلاطین کے عہد میں برعظیم میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ یہ شاہی زبان تھی۔ جس کی تقلید میں پورے ہندوستان میں مقامی زبانوں کے برعکس فارسی کی تعلیم اور ترویج بھی زیادہ رہی۔ اردو زبان کے ابتدائی دور میں بھی علمیت کی علامت میں فارسی زبان ہی سمجھی جاتی تھی۔ ادیب، شاعر اور دیگر تعلیم یافتہ طبقے خط و کتابت کے لیے فارسی کا ہی استعمال کرتے تھے۔ حکومتی ایوانوں میں پرورش پانے کے باعث اس زبان کے خطوط میں بھی پرتکلف اور ثقیل القابات و خطابات استعمال کیے جاتے تھے۔ فارسی میں خط لکھنا عالم فاضل ہونے کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ بادشاہت کی وقعت ختم ہونے لگی تو ان سے وابستہ باقی سماجی اور معاشرتی شعبوں میں بھی تغیر و تبدل شروع ہو گیا۔ اردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح ان تبدیلیوں نے خطوط نویسی کو بھی متاثر کیا۔ یہ فارسی سے اردو میں منتقل ہونے لگی او ر اردو نثر میں اضافے کا سبب بن گئی۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری مرزا اسد اللہ خاں سے شروع ہوتی ہے۔ مگر تحقیق سے یہ ثاب تہو چکا ہے کہ اردو کا پہلا دریافت خط ۱۸۲۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ بقولل عبداللطیف اعظمی:۔

> ''جہاں تک اردو مراسلت کا تعلق ہے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک سب سے پرانا خط جو ملا ہے وہ ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء کا نوشتہ ہے۔ اس کے کاتب نواب حسام الملک بہادر جو کہ کرناٹک کے نواب والا جاہ بہادر کے چوتھے بیٹے ہیں اور مکتوب الیہ ان کی بڑی بھاوج نواب بیگم ہیں۔'' [۳]

یہ وہ دور تھا جب پورے برعظیم میں اردو زبان بڑی شدومد سے بولی، سمجھی اور لکھی جا رہی تھی۔ فورٹ ولیم کے زیر اثر اصنافِ ادب میں خصوصاً نثر میں نئے نئے اضافے منظرعام پر آ رہے تھے۔ اب یہ زبان عوام کی محفل سے اُٹھ کر خواص تک جا پہنچی تھی۔ یقیناً ہر طرف لوگوں نے اردو میں بے شمار خطوط لکھے ہوں گے۔ غلام غوث بے خبر اور غالب کے علاوہ مرزا جان طپش اور راسخ عظیم آبادی بھی اردو میں خطوط لکھتے تھے۔ اردو زبان کا مشہور فرانسیسی محقق گارساں دتاسی بھی اردو میں خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط پیرس کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ادیبوں اور شعراء کی ذاتی اشیاء کو بھی لوگ سماجی ملکیت سمجھتے ہیں۔ جب کہ اس دور کے یقیناً بہت سے خطوط سامنے آنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ انتہائی ذاتی دستاویز ہے۔ غالب کی زندگی میں ہی ان کے خطوط کی مقبولیت اس قدر ہو چکی تھی کہ اُن کے بہت سے چاہنے والوں نے انہیں مرتب کر کے انہیں شائع کر دیا۔ خط کو تہذیبی مرقعوں، ذاتی بیانات، تحریک، ذہنی تسکین کا باعث بننے والے عناصر نے مل کر اِسے ادب کی جان دار صنف بنا دیا۔

خطوط کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ پہلے پہل خطونویسی کی تربیت کے لیے فرضی خطوط بھی لکھے گئے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں خط کا اسلوب اختیار کر کے کسی موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالغفار کی تصنیف لیلیٰ کے خطوط مجنوں گورکھ پوری کے پردیسی کے خطوط۔ نیاز فتح پوری کے خطوط، مکتوباتِ نیاز کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ میرزا ادیب کی تصنیف صحرا نورد کے خطوط بھی انہیں میں شمار ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس

کو کبھی منظرِ عام پر لانے یا سماجی ملکیت بنانے کے خیال سے نہیں لکھے جاتے۔ وہ نجی خطوط ہیں۔ مقالے کے موضوع کی مناسبت سے زیادہ تر نجی خطوط کے حوالے سے دلائل دیئے جائیں گے، کیوں کہ جو صداقت ذاتی قسم کے خطوط میں ہوسکتی ہے وہ کسی سرکاری دستاویز میں ہونا ممکن نہیں۔ خطوط کے حوالے سے قابلِ قدر شعرا اور ادبا کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن کے نامے ہمارے ماضی کی داستانوں کو اپنے اندر پوری صداقتوں کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہاں چند اہم شخصیات کے ذاتی خطوط حوالے کے طور پر پیش کئے جائیں گے۔ خصوصاً اُن کے خطوط کا نمونہ شامل ہے جو تاریخی حوالوں سے زیادہ اہم اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

اردو خطوط نویسی میں تاریخ کے اعتبار سے پہلے خواجہ غلام غوث بےخبر کا نام آتا ہے۔ اگرچہ تپش دہلوی، راسخ عظیم آبادی اور یاس اروی نے بھی تقریباً اسی دور میں خطوط لکھے۔ کیوں کہ اس دور کو اردو زبان ایسی راس آرہی تھی کہ امیر مینائی جیسے شعرا نے بھی اردو میں خط لکھے۔ بےخبر کے خطوط میں بہت سا تاریخی مواد موجود ہے۔ یہ خطوط تسلسل سے لکھے گئے ہیں۔ بےخبر ۱۸۲۴ء میں نیپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین بچپن میں ہی ہندوستان آ گئے تھے۔ بےخبر فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اردو میں بھی شاعری کی۔ اردو میں خطوط نویسی غالب سے بھی پہلے ۱۸۴۶ء میں شروع کی۔ ان کے خطوط میں جزئیات نگاری کے مرقع ہیں۔ معاشرت، تہذیبی و تمدنی اقدار اور لطیف جذبات کا خوبصورت بیان بھی ملتا ہے۔ شاعر ہونے کے باعث منظرکش بہتر طریق پر کرتے ہیں۔ ان کے ابتدائی خطوط ایسے ہی اسلوب کے حامل ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ ان کے خطوط غالب کی طرز پر چلے جاتے ہیں۔ دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔ مقبولیت کا رنگ دیکھ کر شاید بےخبر نے اپنا رنگ بدل لیا۔ اردو خطوط نویسی کے اوّلین دور میں جب علی بیگ سرور کا نام بھی آتا ہے۔ جو اس سے قبل ہی فسانہ عجائب کی مقفیٰ و مسجع نثر کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط کا اسلوب بھی اُس سے کچھ مختلف نہیں۔ ان کے خطوط پر تواریخ درج نہیں محض ان کی داخلی شہادت کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطوط ۱۸۵۵ء یا ۱۸۵۶ء میں لکھے گئے ہیں۔ ابتدائی خطوط ان کے روایتی اسلوب کے حامل ہیں جب کہ بعد کے خطوط میں سادگی و پرکاری کے نمونے بھی ملتے ہیں مگر قافیہ پیمائی موجود ہے۔ وہ موقع کی مناسبت سے بھی اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کا ایک خط ۱۸۵۷ء کے حوالے سے دیکھئے:۔

> ''بھائی جس دن سے یہاں منڈیاؤ لٹا ہے، سارے شہر سے کھانا پانی چُھٹا ہے۔ فلک نے لکھنؤ کی خوب خاک اُڑائی ہے۔ کیا لکھوں جو ایذا دکھائی ہے۔ نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام ہے، ہر دَم جان کا دغدغہ زیست بنام ہے۔ اگر زیست باقی ہے اور جیتے مل جائیں گے، یہی کہانی زبانی سنائیں گے۔'' [۴]

جنگِ آزادی ۱۸۷۵ء نے پورے ملک کے طول و عرض میں کہرام برپا کر رکھا تھا اور زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ جس کی تصویر کشی مسرور نے کی ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ انشائے سرور کے نام سے ہے۔ جو اُن کے منہ بولے بیٹے مرزا احمد علی نے ان کی وفات کے سترہ سال بعد مرتب کیے اور ۱۸۸۶ء میں مطبع نول کشور سے چھپوائے۔ اردو مکتوباتی اَدب کا یہ اوّلین سرمایہ ہیں۔ واجد علی شاہ، تاریخ اودھ کی اہم شخصیت ہے۔ جو عوام

کے لیے کی گئیں اصلاحات کے لیے مشہور ہے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ اس کی رنگین مزاجی بھی ہے۔ اپنی رنگین مزاجی کے باعث ''پیا جان عالم'' کا خطاب پایا۔ ۱۸۵۶ء میں وہ بستر علالت پر تھا۔ تقریباً ایک سال اسی حالت میں گزرا۔ ایک سال بعد جب محل میں اُس کے غسل صحت کی تقریب جاری تھی تو اسے گرفتار کر کے فورٹ ولیم بھیج دیا گیا۔ قید خانے سے واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کو اور بیگمات نے واجد علی شاہ کو خطوط لکھے۔ کچھ بیگمات جو پڑھی لکھی نہیں تھیں انہوں نے شاعروں اور منشیوں کی مدد سے ہجر کے اِن لمحات کی منظر کشی کی۔ ان خطوط کو مفتی انتظام اللہ شہابی نے بیگمات اودھ کے خطوط کے نام سے مرتب کیا۔ ان میں سے بعض خطوط نثر میں ہیں اور بعض منظر عام ہیں۔ ان مکتوبات کی خوبی یہ ہے کہ اِن میں ہجر و فراق کی کیفیات کے اظہار کے علاوہ ان صعوبتوں اور پریشانیوں کا بھی ذکر ہے جو ان کو برداشت کرنی پڑ رہی تھیں۔ واجد علی شاہ کے خطوط اُس کے ادبی ذوق کی دلیل ہیں۔ اس کے خطوط میں اہم تاریخی حوالے بھی موجود ہیں۔

> ''اِن مراسلات میں ہجر و وصال اور اشتیاق و فراق اور سوز و گداز کے سوا ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے مصائب اور حالات کا ابھی ذکر ہے۔ بعض ایسی باتیں خطوط میں نظر پڑیں جن کا تاریخ ہند سے بڑا تعلق ہے۔''[۵]

انشائے سرور میں سات ایسے خطوط شامل ہیں جو بیگمات کی طرف سے شاہ کو لکھوائے گئے تھے اور لکھنے والے رجب علی بیگ مسرور تھے۔ واجد علی شاہ کے ایک خط کا اقتباس یوں ہے۔

> ''صبا بھی ہم قیدیوں کی پیغامبری نہیں کرتی۔ ہر طرف پہرا ہے۔ ہر طرف یاس ہے۔ دو رفیق ہیں ایک خوف دوسرا ہراس۔ ایک قید خانے میں ہم پڑے ہیں۔ چاروں طرف حراست ہے۔ ہمارے ساتھ اٹھارہ آدمی مصیبت جھیل رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے جینے سے بے زار ہے۔ قید غم میں گرفتار ہے۔''[۶]

ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اِن خطوط کی تاریخی اہمیت بھی ہے کیوں کہ ان سے نہ صرف واجد علی شاہ اور اس کی بیگمات کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ اُن حالات کی منظر کشی ہوتی ہے جن سے اودھ کا سابق حکمران اور اُس کی بیگمات گزر رہی تھیں۔ ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور زوال پذیر سلطنت کا پورا بیان ان خطوط میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ واجد علی کا کردار ڈاکٹر خلیق انجم کے خیال میں دیکھئے:۔

> ''اِن خطوط میں اُس عورت کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو جاگیرداری طبقے کے ہاتھوں ذلیل و خوار تھی۔ جس کی ساری زندگی ایک ایسے انسان سے محبت کی بھیک مانگتے گزر گئی جو وفا سے ناآشنا ہوتا اور جو دولت کے بل پر دُنیا کی ہر خوب صورت عورت پر اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔''[۶]

خط تخلیقی ادب کی ایک ایسی صنف ہے کہ انتہائی ذاتی ہونے کے باعث کوئی مکتوب نگار اپنی شخصیت کو پردے میں نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ در پردہ حقائق کو جاننے کے لیے کسی بھی دور کی اہم شخصیات کے خطوط کے حوالے نہایت اہم ہوتے ہیں۔

اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز مرزا غالب سے ہوتا ہے۔ جب انہوں نے خط کے اسلوب کے ساتھ ساتھ اس کے تمام زاویوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ بقول ان کے خط کو مکالمہ بنا دیا۔ اپنی شخصیت کی جدّت

پسندی کے تحت اِس صنف کو جدت کی راہ سجھائی۔ حالؔی کے مطابق غالب نے ۱۸۵۰ء میں اردو میں خطوط نویسی شروع کی۔ جدید تحقیق کے مطابق (بمطابق آفاق حسین لکھنوی) غالب کے اوّلین اردو خطوط ۹ مارچ اور ۴ جون ۱۸۴۸ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے غالب نے اس سے پہلے بھی اردو میں خطوط لکھے ہوں۔ جواب تک منظرعام پر نہ آئے ہوں۔ ان کے خطوط ان کے فکری مزاج کی چاشنی سے لبریز ہیں۔ چست فقرے، خوبصورت نادر تشبیہات، اصطلاحیں استعمال کرتے ہوہے انہوں نے اپنے خطوط کو اردو مزاج نگاری کا بھی نمونہ بنا دیا۔ حالاں کہ غالب نے دورِ انحطاط میں ہوش سنبھالا۔ سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ صدیوں پرانی ایک تہذیب سمندر میں ڈوبتے ہوئے جہاز کی طرح آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف جا رہی تھی۔ نووارد تہذیب یہاں کے تمام سیاسی، سماجی اور تعلیمی منظرنامے کو بدل دینے کے درپے تھی۔ ان کی مکتوب نگاری کی جدت طرازی میں جہاں اُن کی فطرت کا دخل تھا۔ وہاں ماحول کے اثر کے تحت بھی انہوں نے زبان و اسلوب کو پرانے سانچوں سے نکالنے کی سعی کی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ماضی کے روایتی عناصر کو بھی زندہ رکھا۔ اُن کے خطوط کے کئی مجموعے عودِ ہندی (مطبوعہ ۱۸۶۸ء)

اردوئے معلّی (مطبوعہ ۱۸۶۹ء)، اردوئے معلّی (مطبوعہ، ۱۸۹۹ء) مکاتب غالب (مطبوعہ، ۱۹۳۷ء) او رنادراتِ غالب (مطبوعہ، ۱۹۴۹ء) مرتب ہو چکے ہیں۔

غالب کا ابتدائی دور اُن کی ذاتی پریشانیوں اور فکر معاش کا بھی تھا۔ خطوط ان کے دور، شخصیت اور زندگی کا عکس بھی پیش کرتے ہیں۔ محققین نے اُن کے خطوط سے استفادہ کر کے ان کی شخصیت اور دور پر سیر حاصل مقالے لکھے ہیں۔ ان سے نہ صرف اُن کی داستانِ حیات مرتب ہوتی ہے بلکہ انیسویں صدی کی سیاسی کش مکش اور بدلتے ہوئے رُجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مرزا نے اپنے ذاتی حالات کے درپردہ اہم تاریخی واقعات بیان کیے ہیں۔ دلّی کی رنگینیوں کی یادوں سے لے کر اس کے اُجڑے ہوئے گلی کوچوں کی دردانگیز کہانیاں بھی بیان کردی ہیں۔ علاؤ الدین احمد خان علائی کو لکھتے ہیں:۔

''یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ ایک کمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہوں کے ذکور جو بقیہ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اور اناث میں جو پیرزن ہیں۔ کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔''

بسکہ فعال با یزید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زندان کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا

اِن اشعار کے ذریعے مرزا نے پورے حالات کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ یزید کے سپاہیوں کی طرح انگلستان کا ہر مسلح سپاہی شکار کی تلاش میں ہے۔ اِس ڈر سے لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں اور دہلی کا مشہور چاندنی چوک مقتل بن چکا ہے کیوں کہ انگریز اپنی حکومت کے غداروں کو وہاں سرعام پھانسی دیتا تھا۔ اسی طرح کی اور بہت سی شہادتیں غالب

کے خطوط میں موجود ہیں۔ جو ان واسطے تحریر نہیں کی گئیں کہ غالب کے پیش نظر کوئی تاریخی دستاویز بنانا مقصود تھا۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے ہمدرد اور دوستوں کو اپنے شہر اور اپنے لوگوں کے وہ کرب ناک حالات بتائے ہیں جن سے وہ گزر رہے تھے۔ انہی خطوط سے ہم ان مظالم کی بلامبالغہ شہادتیں اکٹھا کر سکتے ہیں جو جنگ آزادی برپا کرنے والے مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ کہنے کو یہ ادب کے فن پارے ہیں مگر زندگی کے تلخ حقائق کی گواہیاں دے رہے ہیں۔ غالب اپنے معاشی حالات کی خرابی کا ذمہ دار بھی انگریز کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کے مطابق ان کی پنشن کی بندش کا ذمہ دار انگریز ہی تو تھا۔ مگر وہ کھل کر کبھی انگریز کے خلاف بات نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے ان کی مدح سرائی بھی کی۔ اپنے نامساعد حالات کے باوجود غالب دلّی چھوڑ کر کہیں نہ گئے۔ اس وفاداری کا تذکرہ اکثر وہ اپنے خطوط میں بھی کرتے ہیں۔ اپنے عزیز شہر اور اس کے امراء، رؤسا کی تباہی و بربادی کے مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور انہوں نے اسی کی لفاظی اپنے خطوط میں کی۔ غالب کے خطوں میں تباہ شدہ دہلی کے مناظر تاریخ کے طالب علموں کیلئے اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہ ان واقعات کی سچی تصویریں ہیں جو غالب کے چشم دیدہ ہیں۔

اپنے عہد کی تفصیلات اگرچہ سرسید، شبلی، آزاد اور حالی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ مگر خطوط غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی بلاغت و فصاحت، سادگی و شوخی نے اردو مکتوب نگاری کو ادبی شان بھی عطا کردی ہے۔ وہ تاریخ کے علاوہ ادبی فن پارہ بھی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں عام انسان کی زندگی تہس نہس کر دی تھی وہیں تخلیقی اذہان کو بھی فکر و نظر اور اظہار کے نئے سانچے دے دیے تھے۔ زندگی کو مختلف انداز سے دیکھنے کی جرأت اور حوصلہ بھی دیا تھا۔

سرسید احمد خان برصغیر کی اہم شخصیات میں سے ہیں۔ ان کے نام بھی اُردو مکاتیب کا ایک ذخیرہ ادب میں موجود ہے۔ جو ادبی مقام سے زیادہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

کسی مصنف کی شخصیت کے داخلی پہلو کا ظہار اس کی تصنیف و تالیف میں اُس طرح سے نہیں ہوتا جس طرح مکاتیب میں ہوتا ہے۔ اس کی ذاتی آرا اور نظریات کا اظہار اس میں زیادہ صداقت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اس وقت کے جدید عصری تقاضوں کے پیش نظر ان کے خطوط ہمیں ذاتی حالات وضروریات سے زیادہ قومی، ملکی، سماجی اور تہذیبی مسائل کے موضوعات پر ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی مسلم قوم (برعظیم کی) کی فلاح کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کے تمام خطوط میں یہ جذبہ نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اِن مکتوبات میں شخصی عناصر موضوع کے لحاظ سے بہت کم ہیں۔ فکر و فہم پر مبنی یہ تحریریں اُن کے شب و روز کی سرگرمیوں اور مصروفیات کا بھی مظہر ہیں۔ اپنے نظریات کی افادیت کے پیش نظر ان کی زبان سہل اور رواں ہے۔ اُن کے زیادہ تر خطوط علی گڑھ کی تعلیمی تحریک اور ملک و قوم کے دیگر مسائل کے متعلق ہیں۔

مکاتیب سرسید کو اُن کی افادیت کے پیش نظر سب سے پہلے حالی نے کٹھا کیا۔ جب وہ سرسید کی وفات کے ۲۸ سال بعد اُن کی سوانح ''حیات جاوید'' مرتب کر رہے تھے۔ اُن سے خطوط کا یہ ذخیرہ سید وحید الدین سلیم نے لیا اور ''معارف'' میں قسط وار چھاپ دیا۔ اس کے بعد شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ان کو ''مکتوباتِ سرسید'' کے نام سے دو جلدوں میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۰ء میں شائع کروایا۔ ان سے پہلے سرداس مسعود اور کریم احمد خان بھی ''خطوط سرسید''

شائع کروا چکے تھے۔ اسی دور میں ''مکاتب مہدی علی'' اور ''مکتوبات وقار الملک'' حصہ دوم محمد امین زبیری ماہر ہروی نے آگرہ سے شائع کیا۔ ان مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ سرسید ہی کے ہم خیال تھے۔

خطوط کی زبان میں قومی و ملی لب و لہجہ بھی سنائی دیتا ہے۔ ان میں ان مقاصد اور تجاویز کی بھی نشان دہی ہوتی ہے جو سرسید کے پیش نظر تھیں۔ مگر زندگی اور حالات نے انہیں مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ''مکتوبات سرسید'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> ''سرسید کے اخلاق و عادات، ان کی سیرت و کردار اور ان کے عقائد و خیالات کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی اِن خطوط کے پڑھنے سے دور ہو جائیں گی۔ کیوں کہ تصنیف و تالیف میں تو انسان تصنع اور بناوٹ سے کام لے سکتا ہے اور اپنے آپ کو ایسا ظاہر کر سکتا ہے جیسا وہ دراصل نہیں ہوتا مگر پرائیویٹ خطوط میں ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ ان خطوط کے متعلق اُسے وہم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کبھی جمع اور فراہم ہو کر شائع ہو جائیں گے۔ چنانچہ پرائیویٹ خطوط سے بہتر کسی لیڈر یا ریفارمر کے اصلی اور واقعی خیالات و واقعات معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔''[۸]

سرسید کی ساری زندگی قوم و ملک کے مصائب اور تکالیف کے حل ڈھونڈنے میں گزری۔ اس عظیم مقصد کی وجہ سے دستور دنیا کے مطابق انہیں بہت سی مخالف قوتوں کا بھی سامنا رہا۔ مذہب کے متعلق جدید وضاحتوں نے ان کی شخصیت کو متنازعہ بنا دیا۔ اگر ان کے خطوط اور مضامین کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کی ذاتی زندگی تو کچھ تھی ہی نہیں۔ ان کی ہر سرگرمی اور ہر عمل ملکی مفاد کی طرف ایک قدم تھا۔

سرسید کے متعلق ایک غلط فہمی یہ بھی رہی کہ وہ انگریز کے درپردہ ساتھی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ایک طرف سرسید احمد خان انگریز کلکٹر (بجنور) کی کوٹھی کے آگے راتوں کو پہرہ دے کر اس کی حفاظت کر رہے تھے تو دوسری طرف دلّی میں انگریزی فوج کے ہاتھوں ہونے والی غارت گری میں سرسید کے خاندان کے بہت سے لوگ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ البتہ جب ہنگامے سرد پڑے اور انگریز نے دوبارہ امورِ سلطنت پر کنٹرول حاصل کرلیا تو حکومت کی طرف سے سرسید کو بھی انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ ایسے میں انہیں ''چاند پور'' ریاست بھی عطا کرنے کی پیش کش ہوئی جو انہوں نے قبول نہ کی۔

وہ اپنی قوم کے لیے ہمدردی رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ جدید تعلیم کی طرف راغب ہو جائیں اور اپنی حیثیت کو منوانے کے قابل ہوں۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر کرنے کے لیے انہوں نے خود اس میدان میں اُترنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ۱۸۵۹ء میں فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کردیا۔ ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی اور جدید علوم کی بہت سی کتب جو دیگر زبانوں میں تھیں اردو میں ترجمہ کروایا تاکہ برعظیم کے لوگ جو اردو سے اچھی طرح واقف ہیں ان علوم سے بہرہ مند ہوسکیں۔ بعد میں اسی سوسائٹی کو علی گڑھ منتقل کرلیا۔ ۱۸۶۶ء میں "Birtish Indian Association" قائم کی تاکہ عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قائم ہو۔ سرسید کی شروع سے ہی

کوشش رہی کہ طاقت ور حکم رانوں سے تناؤ کے بجائے مفاہمی پالیسی اختیار کر کے فائدہ اُٹھایا جائے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی انہوں نے بہت سی مصالحتیں کروانے کی کوششیں کیں۔ ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کی تصنیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس کے ذریعے انگریز کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ فساد برپا کرنے والے ہند تھے مگر تمام ہنگامے کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرادیا گیا۔

۱۸۶۶ء میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی سے ایک اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔ جو ہندوؤں کے تعصب کی بھینٹ چڑھ گئی اور اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہومیو پیتھک ہسپتال قائم کیا۔ سرسید کا قائم کردہ مدرسہ پہلے کالج اور پھر یونی ورسٹی بن گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی مجموعی حالت کی بہتری کے لیے جو جو کوششیں کیں۔ اُن کی فہرست مزید طویل ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کے لیے انہوں نے نہ صرف حکومت سے مدد ملی بلکہ ہر علاقے کے متمول لوگوں کو بھی اس کارِ خیر میں شریک ہونے پر آمادہ کیا۔ اُن کے خطوط جو کسی ذاتی تعلق کے لیے نہیں لکھے گئے تھے۔ بلکہ مقصدیت کے تحت تھے۔ اُن کے بہت سے خطوط انہیں روسا اور امراء کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں جن سے انہوں نے معاونت کی درخواست کی تھی۔

دوسری طرف مسلمانوں کی مذہبی سمت کو درست کرنے کے لیے انہوں نے ایک مصلح ایک ریفارمر کا کردار بھی ادا کیا۔ انہوں نے مذہب کی تشریح کو تجدید دی تا کہ ہندوستانی مسلم جاہل اور کم علم مولوی کے چنگل سے نکل کر نہ صرف اپنے مذہب کی صحیح تعلیم حاصل کرے بلکہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے اندر چھپی اہلیتوں سے بھی کام لے۔ وہ جدید تعلیم حاصل کرے اور اپنے آپ کو زمانے کی دوڑ میں شامل کرے۔ سرسید کی پوری زندگی اپنی قوم کی فلاح کی سعی میں گزری اور یہ دلیل بار بار ہمیں اُن کے خطوط سے ملتی ہے کہ کوئی خط ایسا نہیں جو محض وقت گزاری یا شغل کے لیے لکھا گیا ہو۔

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''بھائی جان سنو! اب وہ وقت نہیں رہا، میں اپنی مکتوباتِ ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں۔ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اُس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے صحیح معلوم ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم کا مذہب سے مقابلہ نہ کرسکیں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔''[۹]

سرسید کے عقائد و نظریات کو لے کر اُن کے مخالفین کے ایک بڑے گروہ نے منفی پراپیگنڈہ کیا۔ جس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اِن خطوط میں ایسے بھی موجود ہیں جن میں انہوں نے اپنے مذہبی عقائد و نظریات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہیں کہیں ان کی وضاحتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مذہب کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ مگر جب ان کے دلائل مکمل ہو جاتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بشری صفات سے معمور بشر اور پکے مسلمان ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ طنز سے بھی کام لیا ہے کہیں ہلکا سا مزاح بھی ہے مگر ہر بات میں ایک سنجیدہ مقصد پوشیدہ ہے۔ تلخ

ہونے کے بجائے دلائل و براہن سے مکتوب الیہ کو اپنی بات پر قائل کرتے ہیں، علمی، تمدنی، مذہبی غرض کسی بھی قسم کے مسائل زیر بحث آئیں تو معلومات کے انبار لگا دیتے ہیں۔ اس طرح اِن خطوط کی ایک حیثیت علمی بھی ہے ۔مگر سب سے بڑھ کر اُن کی زندگی کا محور رہنے والی علی گڑھ کی تعلیمی تحری کی لحہ بہ لحہ تاریخ اِن خطوط سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت پر اُٹھنے والے بہت سے اعتراضات خود بخود رد ہو جاتے ہیں۔ جو ثبوت اور دلائل اِن میں موجود ہیں وہ کہیں اور سے دست یاب نہیں ہوسکتا۔

سرسید سے قبل خطوط نویسی کی سب سے بڑی خصوصیت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے تھی مگر انہوں نے اس طرز کو بدل دیا۔ اُن کی جگہ واقعات اور حائق نے لے لی۔ واقعات و حالات اور شخصی فکرونظر کا زیادہ سے زیادہ اظہار مفید خط کی علامت بن گیا۔ اِن معیارات پر اکبر، شبلی، اقبال اور ابوالکلام آزاد کے خطوط اُترتے ہیں۔

سرسید کے دست راست اور قابل شاگرد مولانا اطاف حسین حالی ہیں۔ جنہوں نے سرسید کی تعلیمی تحریک کو ان کے بعد بھی جاری رکھنے کی سعی کی۔

سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی اردو ادب کے عناصر خمسہ ہیں۔ اِن رفقا نے اردو ادب میں بے پناہ اضافے کیے۔ سرسید نے مذہبی، اصلاحی اور علمی مقالات لکھے۔ آزاد نے تذکرہ و تاریخ کی بنیاد ڈالی، نذیر احمد نے ناول کی۔ شبلی نے سیرت طیبہ اردو میں لکھی اور حالی نے سوانح کی ابتدا اردو میں کی۔ اُن کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' نے اردو میں تنقیدی ادب کو بھی راہ سجھا دی۔ حالی کی دیگر اہم تصانیف میں تریاق سموم، طباق الارض (فرانسیسی ترجمہ) اصول فارسی، مولود شریف، تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے، مجالس النساء حیات سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن سمیت کئی دیگر تصانیف بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین حالی (مرتبہ وحید الدین سلیم پانی پتی) مقالاتِ حالی اور مکتوبات حالی جو اُن کے بیٹے سجاد حسین نے ۱۹۲۵ء میں مرتب کیے۔ اُس کا مقدمہ مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے شاعری میں بھی اپنی سادگی شگفتگی اور لطافت کے جوہر دکھائے۔ ''مسدس حالی'' انیسویں صدی کی مشہور ترین تخلیق رہی۔ ''مناجات بیوہ'' ''برکھا رُت'' ''حب وطن'' اور ''نشاطِ امید'' وغیرہ اردو شاعری کی زینت ہیں۔ رُباعیات اردو کے موجود بھی حالی ہیں۔

سرسید کے دوسرے رفقا کی طرح آپ کو بھی ان کی ہم نوائی کے باعث بعض گروہوں کی مخالفت کا سامنا رہا۔ مسدس لکھنے پر بھی آپ ار اسلام سے بغاوت اور کفر کے فتوے لگائے گئے۔ مگر حالت یہ رہی کہ ۱۸۷۹ء میں آپ نے مسدس لکھا اور ۱۸۸۰ء میں یہ ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں حالی نے اس پر دوسرا دیباچہ لکھا۔ جس میں انہوں نے اس کا ذکر کیا۔

> ''بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جا تا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔''[۱۰]

مولا حالی سرسید کے نظریات و خیالات کے مبلغ تھے۔ انہی خیالات کا پرچار انہوں نے ادبی رنگ میں شعر و نثر میں کیا۔ ان کے مکاتب پر سرسید کی مقصدیت کا رنگ غالب ہے۔ طوط کا لب و لہجہ قومی و ملی ہے۔ وہ فطری طور پر نہایت نرم دل انسان تھے۔ ان کے خطوط میں ذاتیات کا عنصر بھی موجود ہے۔ مگر جذبۂ ملت نمایاں تر ہے۔ وہ قوم کی زبوں حالی پر ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی فطری نرمی انہیں کسی تعصب، جوش و خروش یا غیض وغضب کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ ہر بیان اور ہر دلیل میں ایک اعتدال موجود ہے۔

مکتوبات حالی اِس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ یہ سرید کی تحریک ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس تحریک کی تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ان کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ مولوی عبدالحق ''مکاتب حالی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:۔

> ''خطوں سے انسانوں کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ خطوں میں کاتب، مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ہوگی۔ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل اِن خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔''[۱۱]

وہ سرسید کی طرح خط لکھتے لکھتے جذبات میں نہیں آتے نہ ہی غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ بے ریائی اور خلوص اُن کے الفاظ میں ہے۔ اُن کا ہر خط کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھا گیا۔ مقصدیت کا یہ درس انہوں نے سرسید سے لیا تھا۔ قو کی فلاح کا بیڑا جو انہوں نے سرسید کے ساتھ مل کر اٹھایا تھا۔ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذات نہیں کیا اور اس کی واضح دلیل ان کے خطوط ہیں۔

مولوی نذیر احمد اردو کے اوّلین اصلاحی ناول نگار ہیں۔ انہوں نے بھی خطوط لکھے مگر ان کے بہت کم خطوط منظرِ عام پر آسکے ہیں۔ اکثر خطوط اُن کے بیٹے بشیر احمد کے نام ہیں۔ جس کا مقصد اُن کو پندو نصائح، علم کی فضیلت اور دنیا کی نشیب و فراز سمجھانا تھا۔ اُن کے خطوط کا ایک ہی مجموعہ ''موعظہ حسنہ'' کے نام سے ہے۔ جس کو پروفیسر افتخار صدیقی نے مرتب کر کے ۱۹۶۳ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کروایا۔ جس کا مقدمہ انہوں نے خود لکھا ہے جب کہ دیباچہ محمد عبدالغفور شہباز بہاری کا لکھا ہوا ہے۔ خط کا نمونہ:۔

> ''بڑے دن کی تعطیل میں دہلی آنے کا مصمم ارادہ ہے صرف ایک خدشہ گزرتا ہے کہ اس دفعہ ہجوم ایسا ہوگا کہ ''لاعین رات و لا اذن سمعت'' اخبار سے معلوم ہوا کہ ٹامس صاحب کی ''کوٹھی جہاں نما'' نظام حیدر آباد نے ساٹھ ہزار کرائے پر لی۔ جب کہ اس کا معمولی کرایہ یہ چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں۔''[۱۲]

اِن خطوط میں اگرچہ بہت زیادہ تاریخی حوالے موجود نہیں مگر اُس دور کے معاشرے کا ایک مجموعی رجحان ضرور نظر آتا ہے وہ رجحان اولاد کی اصلاح کا ہے۔ مغربی تہذیب کے تعارف کے بعد یہاں مشرق اور مغرب کے مشترکہ اثرات

جو نئی نسل پر پڑ رہے تھے۔ اُس کی وجہ سے روایت پسند والدین سخت اذیت کا شکار تھے۔ مولوی نذیر احمد کی اصلاحی ناول لکھنے کی طرف ترغیب بھی اسی کا شاخسانہ لگتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد اردو کے عناصر خمسہ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ حامد حسن قادری نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۲ء لکھی ہے اور وفات کا سن جنوری ۱۹۱۰ء کا ہے۔ اُن کے والد محمد باقر تھے۔ انہوں نے دہلی سے ایک اخبار نکالا۔ ۱۸۳۷ء میں یہ اردو اخبار پہلا اخبار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں انہیں انگریز نے قید کرلیا اور بعدازاں دوسرے قیدیوں کے ساتھ گولی ماردی گئی۔ آزاد کو اپنے والد کے ساتھ بہت محبت تھی۔ یہ دُکھ ان کے لیے جانگسل تھا۔ شاید اسی دکھ کی تازگی نے آخری عمر میں ان کو دماغی اختلال کا شکار بنا دیا۔ وہ اکثر دیوانگی کی حالت میں انگریز سرکاری کو گالیاں دیا کرتے تھے۔

آزاد نے شاعری بھی کی مگر ان کا اصل سرمایہ نثر کی صورت میں ہے۔ ذوق کو استاد کرتے تھے اور تمام عمر ان کا بہت احترام کیا۔ ''دیوانِ ذوق'' بھی انتہائی عقیدت سے مرتب کیا۔ کرنل ہالرائیڈ سے منسلک ہوکر فورٹ ولیم کالج کی ملازمت اختیار کی۔ اسی شعبے کے تحت انہوں نے ابتدائی نصاب کی بہت سی ریڈریں لکھیں۔ شاعری میں جدت طرازی اور مقصدیت کو فروغ دینے کی سعی کی۔ ان کی مثنوی ''زمستان'' اور ''ابر کرم'' اردو ادب میں قابل قدر اضافے ہیں۔

قواعد اردو اور قصص ہند فورٹ ولیم کالج کی نصابی ضرورتوں کے لیے لکھی گئی۔ آب حیات کی شکل میں انہوں نے اردو ادب کو تذکرے کی صنف سے روشناس کرادیا۔ اردو میں تاریخ نویسی کی مثال قائم کی۔ ''نیرنگِ خیال'' ''دربار اکبری'' ''سخندانَ فارس'' (فارسی)، تذکرہ علماء، کائنات عرب، سیر ایران وغیرہ ان کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ سپاک و نماک اور فلسفہ الہیات آزاد کی مجذوبانہ تحاریر ہیں۔ آزاد کا اسلوب جدید، دل کش اور جداگانہ ہے۔ جس کی فضا تخیلات، احساسات اور تاثرات سے معمور ہے۔ ان کا تمثیلی انداز تحریر کو داستان بنا دیتا ہے۔

''مکتوباتِ آزاد'' نے بھی ان کی دیگر تخلیقات کی طرح اپنا ایک الگ تاثر قائم کیا ہے۔ ان مکاتیب کو شائع کرنے کا سلسلہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ مخزن میں ۱۹۰۶ء میں ان کے خطوط شائع ہوئے جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تھے۔ کتابی صورت میں سید جالت دہلوی نے پہلی مرتبہ انہیں مرتب کیا۔ دوسری بار ۹۶ خطوط کا مجموعہ ۱۹۲۳ء میں آغا محمد طاہر نے مجلس ترقی ادب سے مرتضیٰ حسین لکھنوی کے دیباچے کے ساتھ شائع کروایا۔ لکھتے ہیں:۔

> ''درحقیقت حضرت آزاد اور اردو زبان دونوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ آپ نے ایسا برا زمانہ پایا جب کہ لوگ ایشیائی تہذیب علمی وجہ الکمال نبھانے میں اپنے میں سکت نہ پاتے تھے اور مغربی رنگ سے اچھی طرح آشنا نہ تھے۔ اس لیے جناب آزاد کو اپنی مساعی اصلاح و ترقی زان میں سالہا سال بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔'' [۱۳]

ان مکتوبات کے توسط سے محمد حسین آزاد کی پرحوادث زندگی کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذاتی حالات کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی کے واقعات بھی اس میں ملتے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں جب پنجاب یونی ورسٹی قائم ہو رہی تھی تو شعبہ تعلیم میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ کالج کے مستقبل کا بھی کوئی فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس سے آزاد کو اپنی نوکری بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اس اندیشے کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط میں کیا۔ جو انہوں نے میجر سید حسن کو لکھا۔ جو انہوں نے ۳ فروری ۱۸۸۳ء کو لکھا۔

''آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونی ورسٹی) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سن لیجئے گا کہ نگل گئی۔'' [۱۴]

اِن مکتوبات سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریز سرکار اگرچہ تعلیم کی مَد میں کام کر رہی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا شروع سے ساتھ دینے والے آزاد جیسے لوگ بھی اس بے یقینی کا شکار تھے۔ انگریز سرکار کے ساتھ ساتھ انہیں اپنوں کی بے اعتنائی کے دکھ نے بھی پریشان رکھا۔ ان کی قدر اس طرح سے نہ کی گئی جس کے وہ حق دار تھے۔ حوادث روزگار، مالی نقصانات نے انہیں قلبی حوادث سے دوچار کر دیا۔ ان کی زندگی کا تمام احوال ان مکتوبات میں موجود ہے۔ جس سے ان تفصیلات کا نقشہ اُبھرتا ہے۔ انہیں اپنی تخلیقات اور تصانیف بہت عزیز تھیں۔ اُن کے بیشتر خطوط میں اپنی کسی نہ کسی تصنیف کی اس وقت کی موجودہ صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔ سب سے زیادہ ''دربارِ اکبری'' اور شعبہ تعلیم کے لیے تیار کیے گئے کورس کے بارے میں تذکرہ ہے۔ یہ خطوط جن اشخاص کو لکھے گئے ان میں لالہ دُنی چند، میجر سید حسن بلگرامی، میجر فلر اور ڈاکٹر لائٹز کے نام زیادہ خطوط ہیں۔ان کے مکتوبات جہاں اُن کی زندگی کا تفصیلی بیان ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کے متعلق مختلف احکامات اور نظام تعلیم کے بارے میں بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ برطانوی سامراج نے جہاں صدیوں پرانی اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچایا وہیں اُس نے ہماری زبان و ثقافت کو بھی متاثر کیا۔ معاشرے کے تمام نظام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیا۔ ایسا نظام تعلیم وضع کیا آج تک اُس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

اردو کے مکتوباتی ادب میں شبلی نعمانی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا کرنے والے شبلی ہیں۔ ان کے مکتوبات نے بھی ادبی تاریخ میں خوبصورت اسلوب کا اضافہ کیا۔ ان کی شخصیت کی انفرادیت اور خود پسندی خطوط میں بھی جھلکتی ہے۔ ۱۹۵۷ء کے ہنگامہ پرور سال میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ غازی پور کے مولانا محمد فاروق سے علوم عقلیہ و ادبیات فارسی و عربی میں تعلیم حاصل کی۔ حصول علم کی خاطر پورے ہندوستان میں دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ ۱۸۷۶ء میں ۱۹ سال کی عمر میں سفر حجاز اختیار کیا۔ مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ شعر و ادب سے بھی شغل رکھتے تھے۔ تعلیم کے بعد والد کا پیشہ یعنی وکالت اختیار کر لی۔ ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ قسطنطنیہ گئے۔ واپس آ کر سفرنامہ بھی مرتب کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد کالج سے استعفیٰ دے دیا اور اعظم گڑھ آ گئے۔ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ قوم کی تعلیمی بہتری کے لیے جو سفر انہوں نے علی گڑھ سے شروع کیا تھا اس کا اگلا پڑاؤ ندوۃ العلما تھا۔ ندوہ کے اندر علما کا ایک ایسا گروہ تھا جو شبلی کے ساتھ ہمیشہ مخالفانہ رویہ اپنائے رکھتا تھا۔

۱۹۱۳ء میں آپ ان سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں آپ ندوہ میں ہی تھے جب اچانک بندوق چل جانے سے

گولی آپ کے پیر میں جا لگی۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹروں کو آپ کی ایک ٹانگ کاٹنا پڑی۔ شدید تکلیف اور صدمے کا یہ دور انہوں نے نہایت صبر اور حوصلے سے بسر کیا۔ ''شعر العجم'' کے دیباچے میں بھی اس حادثے اور تکلیف کا ذکر کیا ہے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے تحت شبلی نے بہت سی دیگر زبانوں کی قابل قدر تصانیف کو اردو میں ترجمہ کروایا۔ ان کی تصانیف میں بلند پایہ تصنیف ''سیرت النبی ﷺ'' جس کی تکمیل آپ کی زندگی میں نہ ہوسکی۔ آپ نے اس کی دو جلدیں تصنیف کیں جب کہ باقی کا کام ان کے شاگرد مایہ ناز سید سلمان ندوی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دیگر تصانیف میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق۔ سیرۃ النبی ﷺ کی دو جلدیں، علم الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، سفرنامہ مصر و روم و شام کے علاوہ بے شمار گراں قدر تصانیف شامل ہیں۔ جہاں تک ان کے مکاتیب کا تعلق ہے۔ یہ آپ اپنی مثال ہیں۔ یہ ایجاز و اختصار کا نمونہ ہیں۔ کہیں شوقِ ملاقات اور ذاتی جذبات کا اظہار۔ اردو کی پہلی بڑی شخصیت جنہوں نے عورتوں سے بھی خط و کتابت کی۔ ان کی دیگر تصانیف کی طرح یہ خط بھی نہایت اہم ہیں۔

شبلی کے اختصار کا نمونہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے ایک بلند پایہ ادیب ہو کر بھی وہ مکتوب الیہ سے دوٹوک بات کرتے ہیں۔ نہ اپنی علمیت کا رُعب جھاڑتے ہوئے تمہید باندھتے ہیں اور نہ ہی پند و نصائح کا دفتر کھولتے ہیں۔ ۱۸۸۳ء میں جب شبلی کا علی گڑھ سے تعلق بنا تو اس وقت تک بھی ان کی شخصیت کے جوہر نہ کھلے تھے۔ مگر سرسید کی صحبت اور علی گڑھ کی فضا ان کو ایسی راس آئی انہوں نے اردو ادب کو اس احساس کم تری سے نکال دیا جو یورپ کی بدولت پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے خطوط میں بھی مقصدیت کا پہلو نمایاں ہے۔

اِن خطوط سے علی گڑھ میں جاری علمی تحریک کے احوال کو تسلسل سے جاننے میں مدد ملتی ہے۔ ''ندوۃ العلما'' کے متعلق مختلف لوگوں کے نظریات اور خیالات کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ شبلی کے خطوط کی ادبی شان و شوکت اپنی جگہ مگر ان میں اس طرح واقعات اور حالات کا بیان موجود ہے کہ روزانہ کی بنیادوں پر تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ مشتاق حسین ''باقیاتِ شبلی'' کے مقدمے میں کہتے ہیں:۔

> ''دراصل شبلی ہماری زبان کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کو پسند کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اُن کی شخصیت کو نظر انداز کر کے ہماری فکر، تہذیبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔''[۱۵]

شبلی کی زندگی کا منفرد پہلو ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے عطیہ فیضی اور نام لکھے۔ عطیہ فیضی کے علامہ اقبال کے ساتھ بھی خط و کتابت رہی۔ دراصل جب ایک ہی طرح کی ذہنی اُپج رکھنے والے لوگوں میں تعلق بنتا ہے تو جنس مخالف کی کشش کے علاوہ اور بہت سے عوامل باعثِ کشش ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ان کے درمیان رہا۔ اقبال برعظیم کی ہی نہیں بلکہ مسلم اُمہ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ۶۵ برس قبل دنیا کے نقشے میں آنے والی تبدیلی کا ایک ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے اُبھرا تو اس کا تصور دینے والی شخصیت علامہ محمد اقبال ہی کی ہے۔ اردو ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اقبال کی تخلیقات پر مبنی ہے۔ یہ ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ ایک پورا شعبہ ''اقبالیات'' کے عنوان سے وجود میں آچکا ہے۔ برعظیم کی آج تک کی واحد ہستی کہ جس پر ساری دنیا سے لوگوں نے تحقیقی مقالے لکھے۔ مذہب، قوم، معیشت، تعلیم، سماج غرض

انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اقبال کی ذہانت نے کرشمہ سازی نہ کی ہو۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت کی کسی ایک جہت پر بحث کرنا ممکن نہیں۔ مگر یہاں اُن کے خطوط کے بارے میں کچھ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ تو ایسی صنف ہے جس میں کاتب اپنی شخصیت کو الفاظ اور اظہار سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ ان کی فکر اور نظریات ان مکاتیب میں واضح ہیں۔ وہ دو قومی نظریہ جس کے اعجاز سے مسلمانانِ ہند نے مملکت اسلامی کا علم دنیا میں بلند کر دیا۔ علامہ نے ان کے علیحدہ تشخص کو اُجاگر کیا۔ جس کا تہذیبی اور تمدنی ارتقا بھی ان خطوط میں موجود ہے۔ ان کے خطوط میں بحیثیت مجموعی اقوال وملل پر کی زندگی پر بحثیں اُٹھائی گئی ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں ایسے خطو ط بھی موجود ہیں جن میں مذہب، فلسفہ اور دیگر علمی مباحث پر حکیمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ اچھے خط کی تعریف یہ ہے کہ اس میں تصنع نہ ہو۔ غالب کی طرح اقبال بھی بہت عمدہ پیرائے میں خط لکھتے ہیں مگر ایک مہذب انسان کی شخصیت تمام خطوط میں نمایاں ہے۔ اقبال کے معلوم خطوط کی تعداد ۱۲۰۰ سے زیادہ ہے۔

اقبال کا اوّلین خط ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا تحریر شدہ ہے۔ جب وہ ایم۔ اے فائنل کے طالب علم تھے۔ یہ خط مولانا احسن مارہروی کے نام ہے۔ اقبال کی مکتوب نگاری کا دور تقریباً ۳۹ سال پر محیط ہے۔ ان کا آخری خط ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۸ء کا ہے (اگرچہ یہ اُن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے، کیوں کہ آخری ایام میں کمزوری کے باعث انہوں نے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا۔)

یہ خطوط ہی تھے جن کے ذریعے اقبال نے اپنے نظریے کو یارانِ نکتہ داں تک پہنچایا۔ ہم خیال علما اور فضلا سے لے کر عوام تک پیغام پہنچایا کہ ہمیں اپنے جداگانہ قومی تشخص کی حالت کرنا ہے۔ ورنہ ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ اپنے دور کے مشاہیر سے ان کے مسلسل روابط تھے۔ جن میں جید علما سے لے کر دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ رفقا ہمیشہ آپ کی ذات کی خوبیوں کو سراہتے رہے۔ مگر آپ کو اپنی تشہیر پسند نہ تھی۔

اقبال کے خطوط میں ان کے نظریات کا برملا اظہار ہے۔ وہ جغرافیائی حدود سے وابستہ ملکی اور نسلی قومیت کو انسانیت کے لیے لعنت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان سے محبت اپنی جگہ مگر خالص محبت مسلم اُمہ کے لیے تھی جو کسی جغرافیائی حدود کی قید میں نہیں تھی۔ علامہ اقبال کے نظریات اور خیالات کا تدریجی ارتقاء ان خطوط میں ملتا ہے۔ جس کا وہ خود بھی اظہار کرتے ہیں۔ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام لکھتے ہیں:۔

> ''میں خالص اسلامی نقطہ نظر کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔''[۱۶]

اقبال کے خطوط میں بعض ایجاز و اختصار کا نمونہ ہیں۔ البتہ کسی علمی مسئلے پر بحث طویل ملتی ہے۔ جس میں ان کی علمیت اور ادبیت کے سارے سوتے بہنے لگتے ہیں۔ مذہب کی حقیقی روح کو سمجھنے والے لوگوں کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ سید سلمان ندوی کے ساتھ محبت اور عقیدت دونوں کا رشتہ تھا۔ اقبال کے مکتوب الہین میں عطیہ فیضی کا نام بھی آتا ہے۔ جو شبلی اور اقبال کی مشترکہ دوست تھیں۔ مولوی عبدالحق نے ان دونوں شخصیات کے عطیہ فیضی کے نام لکھے گئے خطوط کو اردو ادب

کا زیور کہا ہے۔ شاید ان میں کچھ ایسی چیزیں مشترک تھیں جس کی وجہ سے وہ ذہنی سطح پر قریب ہو گئے۔ اُن کے مکاتیب میں ہر وہ نکتہ جس پر اعتراض اُٹھائے گئے یا غلط وضاحتیں کیں اس کو درست کر کے بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھے گئے خطوط میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے تراجم کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ نطشے کے ساتھ ان کے خیالات کی ہم آہنگی درست طور پر مترشح نہیں کیا گیا۔

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ محمد اقبال کو ''سر'' کا خطاب انگریز حکومت کی طرف سے عطا ہوا۔ آپ نے وہ خطاب قبول کرلیا۔ اُنہی دنوں تحریک ترک موالات عروج پر تھی۔ آپ جیسے ذہنی و سیاسی رہنما کا انگریز حکومت کی طرف سے کا خطاب کا قبول کرنا سب کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ ان کے بہت سے احباب کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض سے لوگوں نے اس پر تشویش کا اظہار کیا۔ جس پر آپ نے سرسید بھیک نیرنگ، سید سلمان ندوی اور عبدالواحد بنگلوری وغیرہ پر خطوط کے ذریعے واضح کیا کہ خطاب قبول کرنے سے ان کے ایمان اور ان کے نظریات کو کوئی خطرہ نہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں سچ کہنے سے نہیں روک سکتی۔

جن رہنماؤں کے مقاصد عظیم ہوتے ہیں اکثر انہیں ایسی مخالفتوں کا سامنا بھی رہتا ہے جو شاید ان کے پائے استقلال کو آزمانے کے لیے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اقبال کے خطوط میں اکثر وضاحتیں اور تردیدیں ہیں تاکہ احباب ان کے اقدامات کو غلط تصور نہ کریں۔

سودیشی تحریک پر اُٹھائے گئے سوالات کا جواب میں اقبال نے اس نکتے پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ کوئی ملک اس وقت تک سیاسی آزادی حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنی اقتصادیات کو ترقی دے کر معاشی سطح پر خودکفیل نہ ہو جائے۔ یہ وہ مستند اصول ہے کہ آج بھی اگر ہمارے رہنما اس سے سبق حاصل کریں تو غیرملکی امداد کو انکار کر کے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے ملکی معیشت کی بہتری کے لیے کوشش کریں تو یقیناً پاکستان صحیح معنوں میں ایک آزاد اور خودمختار ریاست بن سکتا ہے۔

تاریخی حوالوں کا مقصد محض ان کو لکھنا، پڑھنا اور یاد کرنا ہی نہیں بلکہ عملی طور پر اُن سے فائدہ اٹھانا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بلاشبہ اردو زبان کے بہت بڑے محسن ہیں۔ زبان کو جدید قواعد وضوابط اور اصول دینے والے مولوی عبدالحق سرسید کے رفقا میں سے ایک تھے۔ جن کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید اور حالی کی تحریک کا اصل وارث بھی قرار دیا ہے۔ جہاں تک مکتوب نگاری کا تعلق ہے۔ مولوی صاحب خط لکھنے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ ان کے اب تک دست یاب ہونے والے خطوط کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اپنی تحریک (اردو زبان کی تحریک) کے سلسلے میں انہوں نے پورے ہندوستان میں دور دراز تک لوگوں سے تعلقات استوار کیے۔ زبان کی تحریک کو وسعت دی اور اس کی اصلاح کے لیے ساری زندگی وقف کردی۔ اپنے خطوط میں بھی بارہا اس کا ذکر کرتے ہیں۔

عام زندگی میں بڑے کھرے اور نفیس شخص تھے۔ خطوط میں بھی دوٹوک اور واضح بات کرنے کے عادی ہیں۔ ان کے قلم میں سرعت ہے۔ اظہار مدعا کے لیے سلیس ار رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ خطوط، دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت سرسید کی تحریک کے تسلسل اور اردو زبان کی اصلاحی

تحریک کے حوالے سے بہت زیادہ ہے۔

ان خطوط میں صداقت، عالمگیر اقدار اور زندگی کے عملی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔''انجمن ترقی اردو ہند'' کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور اس کے خلاف ہونے والی سازشوں کا بارہا ذکر کرتے ہیں۔ ان خطوط سے نہ صرف انجمن کی کارکردگی کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے بلکہ اس دور میں انگریز اور ہندو کی طرف سے کی جانے والی لسانی سازشیں بھی بے نقاب ہوتی ہیں۔

اردو ادب کی ان ہستیوں کی ہر تخلیق کی اہمیت اپنی جگہ، مگر ان کے جذبوں کی صداقت اور جدوجہد کی حرارت کو ان کے خطوں میں ہی محسوس کیا جاسکتا ہے ۔ ان لوگوں نے اپنی زندگیاں جن تحاریک کے لیے وقف کیں اُن کی تاریخ میں اِن خطوں کو کبھی بھی پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ مولوی عبدالحق اردو ادب کے اہم محقق اور نقاد ہیں۔ اس حوالے سے ان کی خدمت گراں قدر ہیں۔ ان کے تحقیقی کارناموں میں اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ''نصرتی، ملك الشعرائے بیجا پور، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر اور مرحوم دہلی کالج معروف تصانیف ہیں۔

مولوی عبدالحق کی وجہ شہرت اُن کے مشہور''مقدمات'' بھی ہیں۔ جن کی اصل ناقدانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۹۵۹ء تک کلاسیکی ادب پر بے شمار مقدمات لکھے جو مقدمات عبدالحق کی شکل میں مرتب ہوکر کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں مقدمہ انتخاب کلام میر، مقدمہ ذکر میر، مقدمہ باغ و بہار، مقدمہ مسدس حالی، مقدمہ سب رَس، مقدمہ مکتوبات حالی، مقدمہ خطوطِ عطیہ بیگم، مقدمہ اردو تنقید کا ارتقاء شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مقالات اور خطبات کی صورت میں بھی اُن کے خیالات ونظریات پر مبنی بیش قیمت مواد موجود ہے۔ لغت نویسی بھی ان کے مختلف النوع کاموں میں سے ایک ہے۔ کلاسیکی ادب اردو کے بارے میں جو معلومات مولوی عبدالحق کے ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہیں ان کا کوئی بدل نہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز ہمہ گیر انقلاب آفرین تھا۔ فکر وعمل کی بنیاد پر کھڑی ہونے والی جدید عمارت میں مذہب کو قدیم ورثہ قرار دے کر ایک طرف کردیا گیا تھا۔ مادی ترقی فکر وعمل کے ساتھ اظہار کے نئے سانچوں کی متلاشی تھی۔ ایسے میں برعظیم کے لوگ ایک تیسرے انقلاب کو برپا کرنے کی تیاری میں تھے۔ متحدہ ہندوستان میں انگیز کی حکومت میں مسلم قوم کئی محاذ ں پر برسرپیکار تھی۔ قومی، لسانی، دینی غرض ہر پہلو سے اس کو شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔ تخلیقی اذہان جہاں ایک طرف ملک و ملت کے تحفظ کے لیے کوشاں تھے تو دوسری طرف زبان و ادب کو بھی جدید فکری ونظری سانچوں میں ڈھالنے کی سعی میں مصروف تھے۔

ابوالکلام آزاد کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات نے نثر میں شعر کا لطف پیدا کردیا تھا۔ انہوں نے زبان کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدیدیت عطا کی۔ ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی سوچ رکھنے والے خاندان سے تھا۔ روایتی تحصیل تعلیم کے بعد ان کی شخصیت کے جوہر کھلنے شروع ہو گئے۔ ان کے علمی مضامین اس وقت کے ادبی جریدوں میں شائع ہونے لگے۔''محزن''، ''لسان الصدق''، ''الوکیل'' اور

''الندوہ'' میں ان کے مضامین پورے ہندوستان میں مشہور ہو گئے۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کو انہوں نے کلکتہ سے الہلال کا اجرا کیا۔ جس نے یہاں کے علمی اور سیاسی میدان میں نئے باب رقم کیے۔ اس کے بعد ''البلاغ''، ''تحریک حزب اللہ'' اور ''تحریک خلافت'' کی بنا ڈالی۔ ابوالکلام آزاد کی زندگی کے یہ دوعشرے اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ۱۹۳۰ء سے پہلے تک وہ اسلامی تجدید و احیا کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات و نظریات کے تدریجی ارتقاء کا تفصیلی اظہار اپنے مضامین اور خطوط میں کیا۔ اس حوالے سے ان کے خطوط بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''مکالماتِ آزاد'' اور ''ترکاتِ آزاد'' مرتبہ مولانا غلام رسول مہر بھی شامل ہیں۔ اُن کے خطوط کے موضوعات کو دو بڑی اقسام سیاسی اور دینی میں واضح طور پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ان کے مکاتیب کا پہلا مجموعہ کاروانِ خیال کے نام سے شائع ہوا۔ جو ضخامت میں مختصر تھا مگر ''غبارِ خاطر'' کی اشاعت کے بعد ان کا شمار منفرد مکتوب نگاروں کی صف میں ہونے لگا۔ ''غبار خاطر'' کے خطوط ۱۹۴۳ء میں منظرعام پر آئے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا تخاطب یا مکتوب الیہ کوئی واحد شخصیت نہیں بلکہ مشرق و مغرب ہے۔

ان خطوط میں ذاتی عناصر بہت کم ہے۔ زیادہ تر دینی، علمی اور ادبی تفصیلات پر مبنی یہ خطوط معلومات کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ ان کے خطوط میں خود کلامی کا انداز نمایاں ہے۔ یہ مولانا کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ تمام عمر اپنی ذات کے محور سے نہ نکل پائے۔ خود پسندی ان کی فطرت میں ایک انفرادیت کی طرح موجود تھی۔ ان کی شخصیت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی اگرچہ خطوط میں جھلکتی ہے مگر مقصدیت کا رنگ نمایاں ہے۔

سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ''ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق کی خط نگاری فن کی تاریخ کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ خصوصاً ابوالکلام کی مکتوب نگاری اختصاص کے اس نقطہ عروج پر پہنچی ہے۔ جہاں ادب کی بین الاقوامی سرزمین نمودار ہو رہی ہے۔''[۱۷]

غبارِ خاطر کا پہلا ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۱۹۴۶ء میں چھپا۔ اس میں کل ۲۴ خطوط ہیں۔ اس میں موجود اکثر خطوط میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ کاروانِ خیال محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے مرتب کیا۔ اس میں ۱۸ خطوط شامل ہیں۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتب سلمان شاہجہانپوری ناشر اردو اکیڈمی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ نقش آزاد مولانا غلام رسول مہر کے نام خطوط ہیں۔ اس میں ۱۸۱ خطوط شامل ہیں۔ تبرکات آزاد ۹۸ مکاتیب و مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔

شبلی نے ماضی پر اعتماد اور تہذیبی تاریخ سے تعلق کا جو درس دیا تھا۔ ابوالکلام کی ''تشکیل جدید'' کی تحریک میں اس کو عملی طور پر برتنے پر اصرار تھا۔ دین کے مبلغین اور مصلحین نے اب تک مدافعتی رویہ اپنایا ہوا تھا مگر ابوالکلام آزاد نے اسے تعمیری جارحیت سے روشناس کروادیا تھا۔

تاریخی حوالوں کے اعتبار سے اردو کے مکتوباتی ادب میں اگلا نام سید اکبر حسین اکبر کا ہے۔ جو ادب میں اکبر الٰہ

آبادی کے نام مشہور ہیں۔ ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ معمولی تعلیم کے بعد ریلوے میں کلرک بھرتی ہو گئے مگر بعد میں ہائی کورٹ میں مثل خوان ہو گئے۔ وہیں پر ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا۔ پہلے منصف اور پھر جج کے عہدے پر فائز ہو گئے ۔ ۱۹۰۵ء میں وہاں پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔ آپ کی سرکاری خدمات کے صلے میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا۔ ان کی زندگی کے دو بڑے صدمات ان کی بیوی کا اکلوتے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ جس نے انگلستان میں انگریز عورت سے شادی کر رکھی تھی۔

ان کا عام تعارف ان کی طنز و مزاح پر مبنی ملی و اصلاحی شاعر ہے۔ مگر وہ اپنے دور میں سرسید کی تحریک کا ردِعمل کے طور پر سامنے آئے۔ وہ فطری طور پر قدامت پسند اور مذہبی آدمی تھے مگر اکبر کی یہ شخصیت تیس سال کی عمر کے بعد کی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک عام رنگین مزاج شخص تھے۔ آہستہ آہستہ مذہب کے ساتھ لگاؤ نے انہیں متین بنا دیا۔ مغربی تہذیب کے بہت خلاف تھے۔ اس دور میں سرسید کے خلاف تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت ان کی تحریک اور شخصیت تنقید کا نشانہ بنانے میں مصروف رہی۔ اکبر الہ آبادی اس کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ انگریز حکومت اور اس کی تائید کرنے والے مقامی لوگ اکبر کے طنز کا مسلسل شکار رہے ۔ ''اودھ پنچ'' اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کر رہا تھا۔ اس میں ایسے لوگوں کے مضامین شامل کیے جاتے تھے جو حکومت کی پالیسیوں پر حرف گیری کرتے تھے۔ اکبر کی شاعری کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ ان کے اشعار، نظموں اور غزلوں کی صورت میں شائع ہونے لگے۔ وہ مادی ترقی میں مغرب کی تقلید کی حمایت تو کرتے ہیں مگر روایت پسندی ترک کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس کی ترقی اعتقادات اور اخلاقیات سے متصادم ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہندوستانی سیاست، تہذیب اور معاشرت کے علاوہ انگریز کے تضحیک آمیز رویے کو بھی اپنا موضوع بنایا۔

انہوں نے اپنے مکاتیب انہی تمام عناصر کا بارہا ذکر کیا ہے۔ ان کے خطوط دوستوں، شاگردوں اور مداحوں کے نام ہیں۔ مذہب کی اہمیت، زندگی سے اس کا تعلق عالم اسلام کی حالت، مسلمانانِ ہند کی بتدریج مٹتی ہوئی تہذیب کے بیان کو اس طرح خطوط میں جمع کیا ہے جیسے کوئی یادداشت کے لیے روزنامچہ ترتیب دیتا ہے۔

ہندوستان کا یہ دور اور اس کا کوئی بھی پہلو اکبر کی طبع آزمائی سے نہ بچ سکا۔ تمام ادارے، تحریکیں، تمام سربرآوردہ اشخاص، تمام اہم واقعات، عالم اسلام، اردو ہندی جھگڑا، مذہبی مناقشات غرض ہر پہلو ان کے پیش نظر رہا۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کے ساتھ ان کے خطوط کا مطالعہ تاریخی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے مرتب ہو چکے ہیں۔ ''مکتوبات اکبر الہ آبادی بنام مرزا سلطان احمد، رقعات اکبر نامہ، خطوط اکبر، خطوط مشاہیر کے علاوہ بہت سے متفرق خطوط نقوش ''مکاتیب نمبر'' ۱۹۵۶ء اور نقوش ''خطوط نمبر'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

نواب محسن الملک، سید مہدی علی، سرسید کے رفقا میں سے ایک اور معزز نام ہے۔ جنہوں نے سرسید کی تعلیمی تحریک میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ سید مہدی علی ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ دس روپے ماہانہ کی ملازمت پر کلکٹری میں بھرتی ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ترقی پائی اور اپنی ذہانت اور محنت کے بل

بوتے پر تحصیل دار ہو گئے۔ قانون دانی پر ان کی دو اہم تصانیف بھی موجود ہیں جو کہ ''قانون مالی'' اور ''قانون فوجداری'' کے نام سے ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں انہوں نے ''آیات بینات'' کے نام سے مذہبی تصانیف مرتب کیں۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پیدائشی طور پر شیعہ تھے بعد میں سنی ہو گئے۔

محسن الملک سید محمد علی کی ادبی زندگی کا آغاز ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین سے ہوتا ہے۔۱۸۹۳ء میں سرسید کے ساتھ تعلق بن جانے کے بعد ساری زندگی ان کے ساتھ ہی بسر کی۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں انہوں نے ۳۰ مضامین لکھے۔ جن کے موضوعات مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی اور اصلای تھے۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی خطابت بھی تھی۔ ان کے خطبوں اور تقاریر کو بھی مرتب کیا گیا ہے۔ ان کے ادبی ورثے میں خوبصورت خطوط بھی شامل ہیں۔ جو انہوں نے مولوی بشیر الدین احمد، انوار احمد مارہروی، محمد امین، وقار الملک، مولوی عبداللہ جان اور حاجی محمد موسیٰ خاں کے علاوہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طلبہ اور احباب کو بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ خطوط سرسید کی تحریک کا ایک اور اہم تاریخی ماخذ ہیں۔

مکاتیب کی زبان سادہ اور آسان ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اردو زبان نے تکلف اور تصنع کا راستہ چھوڑ کر سادگی اور سلاست کا راستہ اپنا لیا اور اس کو یہ راستہ دکھانے میں فورٹ ولیم کا اہم کردار تھا۔ ایک ہی تحریک سے وابستہ ہونے کے باعث اس دور کے لکھنے والوں میں اسلوب کی مماثلت کے علاوہ مقصدیت کی بھی مماثلت ہے۔ ان کا لب و لہجہ اور مدعا ایک ہی ہے۔انیسویں صدی کی اہم تعلیمی تحریک کی جدوجہد، تہذیبی تبدیلیوں اور سماجی حالات کی اہم دستاویز یہ خطوط ہیں۔ مولولوی امین زبیری نے ''مکتوب وقار الملک'' کے دیباچے میں محسن الملک اور وقار الملک کی خدمات کو سراہا ہے اور اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ان کے خطوط سے ان کی اعلیٰ سیرت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

اپنی سیاسی بصیرت سے مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کی تجاویز بھی دیں۔ کھرے انسا ن تھے۔ ہمیشہ اپنے عقائد و نظریات کی حفاظت کی۔ جب سرسید نے ''تبین الکلام'' لکھی تو ان کے ساتھ سخت نارا ہو گئے۔ اس وقت کے دیگر علماء کی طرح آپ بھی انہیں مرتد قرار دے رہے تھے مگر سرسید کے اصرار پر ملاقات میں تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

ملی مفادات کے لیے بھی تادمِ آخر کام کرتے رہے۔ ایسی شخصیات کی تگ و دو کی سرگزشت یقیناً تاریخی حوالوں کے لیے بہت اہم ہے۔وقار الملک برعظیم کی ایک اور اہم شخصیت جن کے حوالے کے بغیر تحریک علی گڑھ کا ذکر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان کا نام مشتاق حسین تھا۔ ۱۸۳۹ء میں یو۔ پی کے ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی طور پر اتنے ذہین کہ چھ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ مکمل کرلیا۔ رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرس اور بعد میں محکمہ انکم ٹیکس میں آ گئے۔۱۸۷۳ء میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک حیدر آباد کی ریاست میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ ۱۸۸۵ء میں آپ کی شان دار خدمات کے صلے میں وقار الدولہ وقار الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔حکومت ہند نے انہیں نواب کا خطاب دیا اور لارڈ منٹو نے تعریفی سند بھی عطا کی۔

قوم کے لیے زندگی وقف کی۔علی گڑھ کالج کو وہ مسلمان قوم کے لے ایک پناہ گاہ اور معراج ترقی سمجھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام میں ان کی مخلصانہ کوششوں کا بھی ہاتھ تھا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان سیاسی سطح پر

اپنے آپ کو منظّم نہیں کریں گے کسی ایوان میں ان کی شنوائی نہ ہوگی۔ اگرچہ وقار الملک نے کوئی ایسی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی جس کو ادبی شاہکار کہا جاسکے۔ ''سرگزشت نپولین بونا پارٹ'' کے نام سے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا۔ علی گڑھ کالج میں ہونے والی تصنیف و تالیف کے بھی نگران تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ ان مضامین کے علاوہ ان کے ۳۶ خطوط ایسے ہیں جن کو محمد امین زبیری نے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ خطوط محسن الملک، حالی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دیگر اہم شخصیات کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں سرسید دبستان کے دوسرے شرکاء کی طرح سادگی اور سلاست کو اپناتے ہوئے مدعا بیان کیا گیا ہے۔ یہ خطوط ادبی لحاظ سے کوئی بھی مقام رکھتے ہوں مگر تاریخی حوالے سے ایک ایسی اہم شخصیت کے خطوط ہیں جو برعظیم کے ایک اہم تحریک کے سرگرم رُکن رہے۔

برعظیم کے سیاسی پس منظر میں ایک اور خط کا تذکرہ یہاں لازم ہے۔ یہ خط محمد عبدالقدیر گرامی نے بدایون کے اخبار ذوالقرنین میں گاندھی کے نام لکھا۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ برعظیم کو دو بڑی قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کے درمیان تقسیم کردیا جائے۔ اس میں انہوں نے صوبوں کی ایک فہرست بھی دی اور تقسیم ہند کا نظریہ تفصیلی طور پر پیش کیا۔ یہ خط مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ خط علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۲۰ء اور دوسری بار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

علی برادران کے زیادہ تر خطوط سیاسی اور قومی مسائل کے بارے میں تھے۔ ان دونوں کی زندگی کا بیشتر حصہ قومی اور سیاسی تحریکوں میں گزرا۔ قوم و ملک کے مفاد میں ان کی تمام سرگرمیوں کی تفاصیل ان خطوط سے حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا شوکت علی کے خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ مولانا جوہر علی کے خطوط بھی غیر مطبوعہ ہیں۔

مکتوبات اگرچہ کسی بھی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ مگر ایسے شخصیات جو زندگی میں بھی ادب اور معاشرے کا سرمایہ رہی ہوں ان کے خطوط معاشرے اور ادب کا ذخیرہ بن جاتے ہیں۔ اردو ادب میں اب تک جمع کیے جانے والے خطوط اپنے اپنے موضوعات کے اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان سے علمی فائدے بھی ملتے ہیں۔ روحانی طور پر مسرت اور ماضی سے وابستگی کا اظہار بھی۔ خط میں مسائل اور ماحول کا بیان مکتوب نگار کے طرز فکر کا ترجمان ہوتا ہے۔

ان مشاہیر ادب کے خطوط کا یہاں تذکرہ کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ''اورل ہسٹری'' کی اصطلاح کے تحت ان کے افادی پہلو کو اُجاگر کیا جاسکے اور مثال کے طور پر ان ماخذات کی نشان دہی کرنا تھا۔ جو تاریخ نویسی کے لیے اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔

خط ایک ایسی صنف ہے جہاں متمدن انسان کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ جب مکتوب نگار، مکتوب الیہ تک اپنے خیالات کی ترسیل کرتا ہے تو اس انتہائی ذاتی قسم کی تحریر کے بارے میں اُس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ کوئی تیسرا شخص اس راز و نیاز میں شریک ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مکاتیب میں انسانی شخصیت کے بہت سے بھید کھیل جاتے ہیں۔ اردو مکتوب نگاری کو غالب نے سادگی اور شگفتگی سکھائی۔ تہذیب اور شائستگی کے معیار کو قائم رکھتے ہوئے بے تکلفی کے عنصر کو بھی اس میں داخل کیا۔ خط کو مکالمہ اور ملاقات بنا دیا۔

نجی خطوط ہوں یا روزنامچے اور یادداشتیں خصوصاً جو مشاہیر ادب نے تخلیق کیں۔ وہ ان کی روز شب کی داستانیں

ہیں۔ اس معاشرے کے مرقعے ہیں جس میں انہوں نے زندگی بسر کی۔ کسی بھی عہد کی تاریخ ان کے حوالوں کے بغیر نامکمل رہتی ہے کیونکہ معاشرے کی جن صداقتوں کو غیر جانب داری سے ان تخلیقات میں سموتے ہوئے جانب داری سے تصنیف یا مرتب کی گئیں تواریخ ان صداقتوں سے یا تو عاری ہوتی ہیں یا دانستہ ان سے پہلوتہی کی جاتی ہے۔ یہ اقدام مصلحتاً بھی ہوتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کو واقعی اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان ادبی تخلیقات سے بھی کماحقہ فائدہ اُٹھانا ہوگا۔عہد ساز شخصیات کے خطوط کے مطالعے سے تاریخ کے تمام تر پہلوؤں کو وضاحت اور دلائل سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خان کے مکتوبات سے برصغیر میں انگریز کی ان تعلیمی پالیسیوں کی قلعی کھلتی ہے جن کو عمومی تاریخ میں بڑے فخر سے برصغیر کے لوگوں کیلئے تحفہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان سے انگریز اور ہندو کی مشترکہ عصبیت کا ثبوت مولوی عبدالحق کے خطوط کے علاوہ شاید ہی کہیں اتنی تفصیل سے موجود ہو۔

اورل ہسٹری کی اصطلاح کے تحت آنے والا مکاتیب کا یہ سرمایہ نہ صرف اردو زبان کے لسانی ارتقاء کا احوال بتاتا ہے بلکہ ان میں موجود عصری مسائل اور اس دور کے اہم واقعات کا بیان اسے تاریخ کا بھی اہم حوالہ بناتا ہے۔ اِن ذاتی نوعیت کی تحاریر میں مستند صداقتیں موجود ہیں جو تاریخی تصانیف میں موجود بہت سے نظریات کا رُخ موڑ سکتی ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر وجہی سے عبدالحق تک سنگ میل پبلشرز لاہور، 1996ء، ص 259

۲۔ گیان چند، پروفیسر اردو کی نثری داستان اردو اکادمی لکھنؤ، 1987، ص 2

۳۔ شہناز انجم، ڈاکٹر ادبی نثر کا ارتقا جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 1985، ص 276

۴۔ خلیق انجم، ڈاکٹر تعبیر و تفہیم مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1996ء، ص 100

۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر تاریخ ادبیات پاکستان و ہند حبیب پریس، مزنگ لاہور، 1972، ص 459

۶۔ خلیق انجم، ڈاکٹر تعبیر و تفہیم مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1996ء، ص 157

۷۔ غلام رسول مہر، مولانا (مرتب) خطوطِ غالب شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1968، ص 63

۸۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ مکتوبات سرسید مجلس ترقی ادب لاہور، 1976، ص 19

۹۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ مکتوبات سرسید مجلس ترقی ادب لاہور، 1976، ص 230

۱۰۔ عبدالحق مولوی مکاتیب حالی مجلس ترقی ادب، 1966ء، ص 101

۱۱۔ ایضاً، ص 194

۱۲۔ افتخار احمد صدیقی (مرتب) موعظہ حسنہ از مولوی نذیر احمد مجلس ترقی ادب لاہور، 1963ء، ص 107

۱۳۔ مرتضیٰ فاضل حسین، سید، لکھنوی (مرتب) مکاتیب آزاد مجلس ترقی ادب لاہور، 1966ء، ص 11

۱۴۔ ایضاً، ص 214

۱۵۔ مشتاق حسین (مرتب) باقیاتِ شبلی مجلس ترقی ادب لاہور، 1977ء، ص 160

۱۶۔ نذیر نیازی، سید (مرتب) مکتوبات اقبال اکادمی لاہور، 1977ء، ص 160

۱۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر وجہی سے عبدالحق تک سنگ میل پبلشرز لاہور، 1996ء، ص 278